© rasailojaraid.com

مظفر حسین

خودی اور آخرت

(۴)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک موت بندۂ مومن کے لیے 'ایک آن' یا 'ایک مقام' سے زیادہ نہیں اس لیے وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ اسے اپنا ایک سرمایہ سمجھتا ہے اور اس پر ایسے جھپٹتا ہے جیسے ہرن پر چیتا یا فاختہ پر شاہین، کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ موت ایک نئی زندگی کی تمہید ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام
ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگِ او را می دہد جانے دگر

قرآن مجید بھی موت کی تمنّا کو ایمان کے امتحان کے طور پر پیش کرتا ہے چنانچہ یہود کو چیلنج کیا گیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِن زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِن دُونِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (الجمعہ: ۶)

(ان سے کہو اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنّا کرو اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو۔)

پھر ایک اور جگہ ان لوگوں کی نفسیات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی بداعمالیاں ہی ان کو موت سے خائف رکھتی ہیں۔ خواہ یہ ہزار سال بھی زندہ رہیں لیکن موت کو کبھی پسند نہیں کریں گے۔

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ٥ وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ج وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِہٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ (البقرہ ۹۴-۹۶)

(ان سے کہو کہ اگر آخرت کا گھر انسانوں میں سے خالصتاً تمہارے ہی لیے مخصوص ہے تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو لیکن یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے کیونکہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو کما کر وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ وہ یہ تمنا نہ کریں۔ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ہزار سال جیے حالانکہ لمبی عمر انہیں عذاب سے دور نہیں کر سکتی۔ اللہ ان کے اعمال سے خوب واقف ہے۔)

ان کے مقابلے میں ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ موت کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتا ہے، کیونکہ اس کی پوری زندگی کی جدوجہد آخرت میں کامیابی حاصل کرنے پر ہی مرکوز رہتی ہے، اس لیے موت کا دن درحقیقت اس کی عمر بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہونے کا دن ہوتا ہے اور اسی خیال سے موت کے وقت اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر جاتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ۔۔۔ چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

حدیث میں موت کو ایک ایسا پل قرار دیا گیا ہے جس سے گزر کر ایک دوست اپنے دوست سے ملاقات کرتا ہے: الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایک مومن کی موت کو اگر یوں بیان کرتا ہے کہ یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ٥ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ٥ (الفجر: ۲۷-۲۸) "اے مطمئن روح چل اپنے رب کی طرف، تیرا پروردگار تجھ سے خوش ہے اور تو اس سے خوش ہے" تو دوسری طرف ایک گناہ گار اور کافر کی موت کا منظر یوں پیش کرتا ہے کہ گویا کسی جانور کو زبردستی ہانک کر لے جایا جا رہا ہے۔ وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ ٥ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ٥ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ٥ (القیامہ: ۲۸-۳۰) "اور سمجھا کہ وقتِ جدائی آپہنچا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی۔ اس دن تیرے رب کی طرف ہانکا جانا ہے۔"

مزید وضاحت کے ساتھ یہ منظر کشی مندرجہ ذیل آیات میں کی گئی ہے:

ؔ دل بکسے نباختہ یا دو جہاں نساختہ ۔۔۔ من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَوْ تَرٰیٓ اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۔ کاش تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روحیں قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے چہروں اور کولھوں پر اور کہتے ہیں لو اب جلنے کی سزا بھگتو۔"

وَلَوْ تَرٰیٓ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ ..... الانعام: ۹۳ ۔ کاش تو دیکھے جب ظالم سکراتِ موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے کہتے ہیں نکالو اپنی جانوں کو، آج تمہیں ذلّت آمیز عذاب دیا جائے گا۔"

اس کے برعکس موت مومن کے لیے ایک تحفہ ہے جس پر وہ خدا کا شکر بجا لاتا ہے اور اس تحفہ کے حصول کے لیے انسان جان کی بازی لگا دے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق — آفریں تکبیر در جنگاہِ شوق
آں کہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را — کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے میری آرزو یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑوں اور قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں" اس حدیث کے الفاظ میں ایک مومن کا تصوّرِ موت و حیات اور اس کا نظریہ محبّت و شوق ایسی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ اتنے مختصر الفاظ میں ایسے جامع مضمون کو بیان کرنے کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ گویا زندگی ہے تو اس لیے کہ نثارِ رہِ یار ہو اور موت ہے تو اس لیے کہ محبت جان کی قربانی پیش کرنے سے کم پر مطمئن ہی نہیں اور محبت ہے تو ایسی عمل انگیز کہ اس کے سامنے زندگی اور موت دونوں بے حقیقت ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ محبت کے دو مقام ہیں:

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات — کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

قرآنِ حکیم نے جس طرح بار بار جنت اور دوزخ کے بیان میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ تمہارے عمل کی جزا ہے اس لیے علامہ اقبال اگر دھیر تری ہری کے الفاظ میں، یہ فرماتے ہیں کہ؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیشِ آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گزار　　زانکہ خیزد زعمل دوزخ و اعراف و بہشت

یا یہ کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تو درحقیقت آپ قرآنی تعلیمات ہی کی توضیح و تشریح کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو اس لیے نہیں بنایا کہ بعض لوگوں کو عذاب دے کر وہ خوشی حاصل کرے نہ وہ یہ ہی چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے عذاب میں مبتلا ہوں۔ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا (النساء: ۱۴۷) "اللہ کو تمہارے عذاب سے کیا کام۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہاری شکر گزاری کو قبول کرنے والا اور تمہارے حال کو جاننے والا ہے"

فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (توبہ: ۷۰) "اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں"

اس لیے علامہ اقبال زندگی اور موت، جنت اور جہنم سے زیادہ عمل پر زور دیتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک خیر و شر کا معیار ہی یہ ہے کہ جو عمل خودی کو استحکام بخشے وہ خیر ہے اور جنت ہے اور جو عمل خودی میں اختلال و انتشار پیدا کرے وہ شر ہے اور دوزخ ہے۔ عمل اور سعی کی بدولت اس زندگی میں ایسا استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے کہ وہ موت کے صدمہ سے محفوظ رہے۔ چنانچہ وہ موت کو ایک راستہ تصور کرتے ہیں جسے قرآن "برزخ" کا نام دیتا ہے۔ برزخ ان کے نزدیک انتظار و توقف کی کسی انفعالی کیفیت کا نام نہیں بلکہ خودی کا وہ عالم ہے جس میں اسے حقیقتِ مطلقہ کے بعض نئے پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے، اور جن سے تطابق و توافق کے لیے اسے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ تم لوگ قبر میں آزمائے جاؤ گے (تُفْتَنُوْنَ فی القبور) اور قبر درحقیقت برزخ ہی کا اصطلاحی نام ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں نفسِ انسانی کے اندر زبردست اختلال رونما ہوتا ہے، بالخصوص ان انسانوں میں جنہوں نے اپنی ذاتی نشو و نما کے انتہائی مدارج طے کر لیے ہیں اور جن کی خودی زمان و مکان کے ایک مخصوص نظام میں کسی مقررہ طرزِ عمل کی عادی ہو چکی ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ غیر تربیت یافتہ خودی ہلاک ہو جائے۔ علامہ اقبال کے نزدیک خودی کو ہر حالت میں اپنی جد و جہد جاری رکھنی چاہیے تاکہ اس میں حیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد الموت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جنّت اور دوزخ بھی ان کے نزدیک مقامات اور جگہوں (LOCALITIES) کے نام نہیں ہیں بلکہ ان کے احوال (STATES) ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں جنّت اور دوزخ کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس کا مقصود بھی یہی ہے کہ ایک داخلی حقیقت یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: انما ھی اعمالکم تردّ الیکم "تمہارے ہی اعمال تمہاری طرف لوٹائے جاتے ہیں" اسی طرح قرآنِ پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (مدثر) كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنٌ (طور ۲۱) "ہر نفس اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہے"

چنانچہ دوزخ کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچتی ہے) کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ یہ انسان کے اندر بہ حیثیت انسان اپنی ناکامی کا کرب انگیز احساس ہے۔ اسی طرح بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت یعنی سلامتی ہی سلامتی اور خوف و غم سے نجات۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل) "جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں ملائکہ قبض کرتے ہیں اور کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو، جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے"

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ "اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جایا جائیگا یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہونگے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے سلامتی ہو تم پر تم پاک ہوئے پس داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے۔"

ان آیات میں "طَيِّبِيْنَ" اور "طِبْتُمْ" کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں جن کے ساتھ سلامتی مشروط کی گئی ہے۔ گویا پاکیزگیٔ نفس اور فرحتِ نفس جنتی زندگی کا پہلا تجربہ ہے جس کے نتیجے میں اسے سلامتی عطا کی جاتی ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بعث بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں بلکہ خودی ہی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے اور جسے انفرادی یا اجتماعی جس لحاظ سے بھی دیکھیے دونوں صورتوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محاسبہ ذات کی وہ ساعت ہے جس میں خودی اپنے گذشتہ اعمال کا جائزہ لیتی اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے۔

حشر بلا شقِ قبر و نفخِ صور   عشق شور انگیز خود صبحِ نشور

چنانچہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک دوزخ بھی ابدی لعنت کا ایسا مقام نہیں ہے جسے کسی منتقم خدا نے اس لیے تیار کر رکھا ہے کہ گنہگار اس میں ہمیشہ ہمیشہ گرفتارِ عذاب رہیں۔ وہ درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمتِ خداوندی کی نسیم جانفزا کا اثر قبول کر سکے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اگرچہ جہنم کے لیے "خلود" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کی تشریح دوسری آیات میں اس طرح کر دی ہے کہ اس سے مراد ایک مدت زمانی ہے

لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ہ "وہ دوزخ میں صدیوں پڑے رہیں گے"۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دوزخ میں "خلود" کی ایک انتہا بہر حال ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جہنّمیوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حتّی اھذبوا ونقّوا اذن لھم فی دخول الجنّة "یعنی یہاں تک کہ جب گناہگار چھٹ جائیں گے اور پاک وصاف ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔

یہاں "تہذیب" اور "تنقیہ" کے الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ عربی زبان میں تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخوں کو کاٹ ڈالا جائے تاکہ ان میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو اور وہ نشوونما پاسکیں۔ اسی طرح "تنقیہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے فاسد مادّے کو خارج کر دیا جائے تاکہ وہ طیب ہو جائے۔ اسی طرح قرآن حکیم کی سورۃ القارعہ دوزخیوں کے بارے میں فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ اور سورۃ رحمٰن میں جہنّم کی کیفیات کے ضمن میں آلاء (نعمتوں) کے الفاظ بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جہنّم کا عذاب بھی انسان کی تہذیب و تنقیہ کے لیے ہے تاکہ وہ اصلاح پذیر ہو کر نشوونما کے قابل ہو جائے۔

سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف اور صریح آیت موجود نہیں جس سے دوزخ کے بقائے دوام، عدمِ انتہا اور تسلسل وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدمِ انقطاع و عدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔" اس ضمن میں سورہ ہود کی مندرجہ ذیل آیات پیش کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَّشَھِیْقٌ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

(ہود : ۱۰۶-۱۰۸) "پس شقی (بدبخت) لوگ دوزخ میں جائیں گے اور اس میں وہ ہانپیں گے اور پھنکاریں گے اور اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں الّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے بیشک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے لیکن سعید (خوش قسمت) لوگ جنت میں جائیں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے، یہ بخشش غیر منقطع ہوگی۔"

چنانچہ سیّد سلیمان ندوی اس کی تشریح میں فرماتے ہیں "اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمۂ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارے میں اپنی مشیت ظاہر فرما دی ہے کہ وہ مسلسل و غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیّت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے" اس طرح آپ نے متعدد احادیث درج کرکے اس بات کی پوری طرح وضاحت کردی ہے کہ دوزخ کو دوام نہیں ہے چنانچہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیاتِ لامتناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کر سکے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں۔ بہشت ہے اور اُس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی، دوزخ ہے۔"

اسی قسم کے خیالات کا اظہار حافظ ابنِ قیّم نے اپنی کتاب "شفاء العلیل" میں کیا ہے۔

"اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہوگیا تو خیر، ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا اور اگر یہ نجات کے لیے کافی ہوگیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح مجدّد الف ثانی مکتوبات میں لکھتے ہیں :

"قبر، دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ ہے جو اس عذاب دنیوی سے مناسبت رکھتا ہے اور انقطاع پذیر ہے اور دوسری وجہ سے عذاب آخرت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ آیۂ کریمہ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا (صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں) عذاب قبر میں نازل ہوئی ہے۔ وہ شخص بہت سعادت مند ہے جس کی لغزشوں اور قصوروں کو بخش دیں مواخذہ نہ کریں اور مواخذہ کے مقام میں وہ آئے بھی تو دنیا کی مصیبتوں کو کفارہ بنا دیں اور کچھ باقی رہ جائے تو قبر کی تکلیفوں کو کفارہ بنا دیں تاکہ پاک ہو کر وہ محشر میں مبعوث ہو۔"

غرض جن علمائے الٰہیات اور فلاسفۂ اسلام نے بھی حیات بعد الموت کو اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے ان کی تحریروں پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برزخ، دوزخ، اعراف و بہشت کو خودی کے اندرونی احوال سے تعبیر کرتے ہیں جن کی باطنی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی خارجی مناظر کی شکل میں منظر کشی کی ہے اور یہ اسلوبِ بیان ہر ذہنی سطح کے شخص کی تفہیم کے لیے کفایت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جنت و دوزخ کے متعدد مقامات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً جنت کے ذکر میں جنت الماویٰ، دار المقام، دار السلام، جنت خلد، جنت روضہ، جنت نعیم، جنت عدن، فردوس اور اسی طرح جہنم کے ذکر میں جہنم، کالظیٰ، حطمہ، سعیر، سقر، جحیم، ہاویہ اور عذاب کے ضمن میں عذاب النار، عذاب عظیم، عذاب الحریق، عذاب الیم، عذاب غلیظ، اسفل من النار، ویل، غیّ، زمہریر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ اور یہ سب اس لیے کہ عمل کے میدان میں ہر کافر اور ہر مومن کا حال مختلف ہے اور اسی کے مطابق اس کا عمل ہے کیونکہ ہر عمل کا نتیجہ اس کی نیت سے وابستہ ہے۔ پھر قرآن کریم میں مومنین کو مدارج کے اعتبار سے مختلف درجوں مثلاً اصحاب یمین، سابقون اور وارثون میں دکھایا گیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر جنتی کی جنت دوسرے جنتی کی جنت سے اور ہر جہنمی کا جہنم دوسرے جہنمی کے جہنّم سے مختلف ہے۔ چنانچہ قیامت کے روز ہر شخص کے نامۂ اعمال کا الگ الگ جائزہ لیا جائے گا اور اسے جزاءً وفاقاً کے مصداق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ آپؐ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے جنہوں نے کچھ اچھے کام کیے تھے اور کچھ بُرے اس لیے ان کا آدھا دھڑ نہایت خوبصورت اور آدھا سخت اور بدصورت تھا۔ جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاؤ اور اس نہر میں پڑ جاؤ جس میں خالص سفید پانی بہ رہا تھا اور وہ اس میں غوطہ لگا کر نکلے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور وہ نہایت خوبصورت ہو گئے۔

غرض یہ کہ جنّت اور دوزخ کے بیانات میں قرآن اور احادیث میں تمثیلی پیرائے میں زندگی کو ایک مسلسل حیاتی عمل کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدّین صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"دوزخ، شعورِ مطلق سے فراق یا دُوری کی کیفیت ہے تو بہشت شعورِ مطلق سے قرُب کی کیفیت۔ لہٰذا دوزخ اور بہشت، دونوں کے کچھ ایسے مدارج ہیں کہ دوزخ کے بلند مدارج بہشت کے پست مدارج کے قریب آتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک درمیانی درجہ بھی ہے جس کا تعلق نہ تو دوزخ سے ہے اور نہ ہی بہشت سے (یعنی مقام اعراف)، اور یہ وہ کیفیت ہے جب انسانی شعوُر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ محبوب سے نہ تو واصل ہے اور نہ ہی اس سے دُور۔ دوزخ اور بہشت کے مختلف مدارج ایک ہی زینۂ حقیقت کے مختلف درجے ہیں جن پر ہر ایک انسان کو ایک نقطہ سے آغاز کر کے چڑھنا پڑتا ہے۔ یہ نقطہ ارضی زندگی کے اختتام تک انسان کی محبوب تک رسائی کے مطابق بلند بھی ہو سکتا ہے اور پست بھی۔ دوزخ یا بہشت کی ہر کیفیّت قطعی عارضی نوعیت کی ہے اور جُوں جُوں انسان اپنے آپ کو ان کا سزاوار ٹھہراتا جاتا ہے وہ بلند تر مدارج کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں کشاں کشاں اپنی منزل یعنی شعوُرِ مطلق سے ہمکنار ہونے کا آرزومند ہے"۔

"جنت اور دوزخ کے مدارج ایک ہی راستہ کی مختلف منزلیں ہیں۔ موت کے بعد اس راستہ پر خودشعوری کا سفر جس منزل کی طرف شروع ہوتا ہے وہ اسی حد تک بلند یا پست ہوتی ہے جس حد تک خودشعوُری اپنی ارضی زندگی کے اختتام کے وقت محبوبِ حقیقی کا قرب یا بُعد حاصل کر چکی ہوتی ہے۔ تاہم اس راستہ کی ہر منزل پر خودشعوُری کا مقام عارضی ہوتا ہے اور بالآخر وہ ہر مقام سے آگے گزر جاتی ہے کیونکہ اسے اپنے کمال کی منزل پر پہنچنا ہوتا ہے۔ جنت میں پہنچ کر بھی خودشعوُری کا جذبۂ حسُن اسے بے قرار رکھتا ہے اور وہ ہر آن چاہتی ہے کہ حُسنِ حقیقی کی ایک جھلک دیکھ لے اور اُس کے نوُر سے اپنے آپ کو منوّر کر لے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ اہلِ جنت کے دل اگرچہ نوُرِ محبّت سے روشن ہوں گے تاہم ان کی دعا ہوگی کہ "اے ہمارے خُدا ہمارا نوُر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکمل کر دے۔" (رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا)

بقول علّامہ اقبالؒ

"جنّت بھی لطف و عیش یا آرام و تعطّل کی کوئی حالت نہیں۔ زندگی ایک ہے اور مسلسل۔ اور اس لیے انسان بھی اس ذاتِ لامتناہی کی نو بہ نو تجلیات کے لیے، جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔ پھر جس کے حصّے میں یہ سعادت آئی ہے کہ تجلیاتِ الٰہیہ سے سرفراز ہو وہ صرف ایک مشاہدے پر قناعت نہیں کرے گا۔ خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے جس کا ہر عمل ایک نیا موقف پیدا کر دیتا اور یوں اپنی خلّاقی اور ایجاد و طباعی کے لیے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔"

جنّتِ مُلّا مئے و حُور و غلام　　جنتِ آزادگاں سیرِ دوام

جنّتِ مُلّا خور و خواب و سُرود　　جنتِ عاشق تماشائے وجود

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست　　بے جمالِ لایزال آسودہ نیست

عالمِ آخرت کے بارے میں قرآن پاک نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ عالمِ آخرت کی حقیقت اگرچہ ہماری علمی رسائی سے ماوراء ہے تاہم اس کو ایک محسوس حقیقت کے طور پر جاننے کے لیے ناگزیر ہے کہ انسانی فہم کی مجبوری کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے اسی زبان و محاورہ میں بیان کیا جائے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اپنی موجودہ زندگی میں بھی جب ہم مجرّد احساسات کو بیان کرتے ہیں تو یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں، مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ میرا دل زخمی ہے یا میرے جگر میں آگ لگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ واقعتہً دل زخمی ہو گیا یا جگر میں واقعتہً آگ لگ گئی بلکہ اس کا مقصد فقط یہ ہوتا ہے کہ ایک داخلی احساس کا ابلاغ ہو جائے اور اس میں ہم کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں اُخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ اسی دنیا کے مادّی ماحول، مادّی مفہوم اور جسمانی تخیلات میں ہی لپٹے ہوئے آتے ہیں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی کیفیت بھی مادّی ہی ہے۔ بہشت کے متعلق مجدّد الف ثانی فرماتے ہیں:

"بہشت کے درختوں، نہروں، حُور و غلمان کو دُنیا کی اشیاء کے ساتھ کچھ بھی مناسبت نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی نقیض ہیں جیسا کہ غضب اور رضا ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ اشجار و انہار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ جو بہشت میں ہیں سب اعمال صالح کے نتائج اور ثمرات ہیں"۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم حور و غلمان کے متعلق لکھتے ہیں:

"جنت میں خود شعوری کو جو انتہائی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا باعث خود شعوری کا یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انتہائی حسن و جمال رکھنے والی ایک شخصیت کی محبت میں پوری طرح کامیاب ہوئی ہے۔ اس دنیا میں ہم نہ اس مسرت کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ جنت کی یہ مسرت کچھ کچھ اس مسرت سے مشابہت رکھتی ہے جو ایک نوجوان مرد یا ایک نوجوان عورت کے دل میں جنس مخالف کے ایک نوجوان، خوبصورت محبوب کی ایسی اُلفت اور محبت سے پیدا ہوتی ہے جو ابھی جنسی خواہش سے ملوث نہ ہوئی ہو[1]۔ اور اس کی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ جبلّتِ جنس، خود شعوری کے جذبۂ حسن سے تراشی گئی ہے اور جنسی محبت کا آغاز ایک ایسی محبت سے ہوتا ہے جو روحانی نوعیت کی ہوتی ہے ...

... لہٰذا ہم یہ باور کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ خود شعوری اپنی حالت جنت میں فی الواقع یہ دیکھے گی کہ وہ جنسِ مخالف کے افراد کے دلنواز حسن و جمال اور مسرور انگیز ہم نشینی سے بہرہ ور ہو رہی ہے۔ اگرچہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ جنتی محبوب ارضی محبوبوں سے بدرجہا زیادہ خوبصورت

---

[1] ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جنسی محبت میں روحانی عنصر کی نشاندہی کرتے ہوئے محبت کو سراسر ایک روحانی تجربہ قرار دے کر نہایت بلیغ انداز میں فرائڈ کی تردید کی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلی راحت اور آسودگی جو ایک مرد اور ایک عورت کو ایک دوسرے کی محبت میں محسوس ہوتی ہے جنسی نوعیت کی نہیں ہوتی۔ یہ ویسی ہی ایک روحانی مسرت ہوتی ہے جیسی کہ ہم میں سے کوئی ہنر کے ایک شاہکار کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ جنسی فعل سے جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت اس سے بالکل جدا ہے۔ جنسی محبت کے اوّلین آغاز میں فریقین کو جنسیت کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ جب ابتدائی روحانی کشش مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا کام کر چکتی ہے تو دونوں کا قرب جنسی خواہش کو بیدار کرتا ہے۔ اس وقت ابتدائی بلند قسم کی روحانی مسرت بعد کی گھٹیا قسم کی جنسی لذت کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں گے اور ان کی محبت اور ہم نشینی ان سے بدرجہا مسرت بخش ہوگی۔ خود شعوری کے اس نظارہ اور تجربہ کی وجہ یہ ہے کہ خود شعوری اگلی دنیا میں اپنی ذہنی کیفیتوں کو خارجی شکل دے گی اور ایسا کرتے ہوئے ان اشیاء کو کام میں لائے گی جو اس دنیا میں اس کے تجربہ میں آچکی ہونگی اور جو اس کی ذہنی کیفیتوں کے خارجی تجسّم اور تشکّل کے لیے موزوں ترین ہونگی"۔

آخرت کی زندگی کو اگر خواب کی تمثیل پر قیاس کیا جائے تو خواب کی نفسیات کے بارے میں فرائڈ کے مندرجہ ذیل انکشافات سے اُخروی زندگی کے متعلق ایک ایسا تصوّر قائم کرنے میں مدد ملتی ہے جو قرآن کے بیان کردہ تصوّر سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ جاگنے کی حالت میں شعور کام کرتا ہے اور لاشعور اس حد تک معطل ہوتا ہے کہ شعوری طور پر ہم اس کا احساس نہیں کرسکتے جبکہ خواب کی حالت میں لاشعور کام کرتا ہے اور شعور معطّل ہوجاتا ہے۔ چونکہ ہماری عملی زندگی شعوری زندگی سے ہی تعلق رکھتی ہے اس لیے ہم اپنی موجودہ زندگی میں ایسا محسوس کرتے ہیں گویا ہمارا لاشعور سویا ہوا ہے۔ آخرت کی زندگی میں ہمارا لاشعور جاگ (ACTIVATE) اٹھے گا اور جو کچھ اس کے اندر شعوری زندگی یعنی عملی زندگی کے راستے سے اس میں ڈالا جاتا رہا ہے سب کچھ اُگل دے گا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا سارا نامہ اعمال سامنے آجائے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا (لوگ اس دنیا میں سوتے ہوئے ہیں جب مرینگے تب جاگیں گے)

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے!
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

یعنی بعث بعد الموت پر انسان کی بصارت تیز ہوجائے گی اور ان تمام حقائق کو اس وقت جان لے گا جو موجودہ زندگی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ (ق-۲۲)

(اس سے پہلے تم ان حقائق سے غفلت میں تھے پس آج ہم نے ان حقائق کو کھول دیا اور اب تمہاری نظر خوب تیز ہے)۔

چنانچہ قرآنِ پاک نے اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک جگہ یوں منظر کشی کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۝ (السجدہ : ۱۲)

(کاش تو وہ منظر دیکھے کہ گناہگار سر جھکاتے اپنے پروردگار کے سامنے آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا، سُن لیا تو اب ہمیں دنیا میں لوٹا دے تاکہ ہم نیک عمل کریں۔ بلاشبہ اب ہم اہلِ یقین ہیں)۔

ان مجرمین کے مقابلے میں مومنین کی اس دنیا میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ لما ازددت یقیناً لو کشف الغطاء۔ (اگر پردہ ہٹ جائے تو بھی ہمارے یقین[1] میں کوئی اضافہ نہ ہو)۔

---

[1] یقین ہی کے بارے میں امام غزالی کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں:

"منزلِ معقولات کے آگے بھی ایک منزل ہے جو انبیاء علیہم السّلام اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی منزل ہے۔ اس کی مثال ہوا پر چلنے کی ہے۔ اسی بات کے متعلق لوگوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ جناب عیسیٰ السّلام پانی پر چلتے تھے تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا:

وَلَوْ ازداد یقیناً تمشی فِی الْھَوا (یعنی اگر وہ علم یقین کے اعلیٰ مراتب زیادہ جانتے تو ہوا پر چلتے)۔

آدمی کے سفر کی منزلیں اس کے عالمِ ادراک سے تعلق رکھتی ہیں پھر جب وہ منزل پر پہنچتا ہے جو فرشتوں کا درجہ ہے جو انسان کی معرفت کی آخری کڑی ہے۔ یہ سب باتیں انسان کی ذاتی جدوجہد سے تعلق رکھتی ہیں کہ وہ اعلیٰ علیّین تک پہنچ جاتے یا اسفل السافلین میں گر جائے۔ ... ... فرشتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وما منّا الا لہٗ مقام معلوم (یعنی ہر فرشتے کا درجہ متعین کر دیا گیا ہے اسی طرح چوپاؤں کے لیے اسفل السافلین کا درجہ مقرر کر دیا گیا ہے اُن کے لیے ترقی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ... لہٰذا جو آدمی منزلِ محسوسات اور منزلِ تخیلات کو ہی اپنا مسکن بنا لیتا ہے اس پر رُوح کی حقیقت کی معرفت عیاں نہیں ہوتی لہٰذا وہ روحانی نہیں بن سکتا ـــــ یقین اور ارادے کا آپس میں نہایت ہی گہرا تعلق ہے بلکہ بعض فلاسفہ نے تو ایمان کی تعریف ہی یہ کی کہ ایمان حقیقت میں ایسے خیال کو کہتے ہیں جس پر ارادہ اور جذبہ کا غلبہ ہو۔ اقبالؔ جن کے نزدیک ایمان ہی خودی کی حقیقی زندگی ہے فرماتے ہیں ... حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) نفسیاتِ خواب کے بارے میں فرائڈ کی دوسری بڑی تحقیق لاشعور کی صنعتِ تمثیل گری (DREAM SYMBOLISM) ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتا ہے: "فی الحقیقت یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ لاشعور میں ایک خاص قسم کے علم (جسے وہ UNCONCIOUS KNOWLEDGE کا نام دیتا ہے) کی صلاحیت ودیعت ہے جس کی مدد سے وہ مختلف اشیاء کی باہمی مماثلتوں کو کام میں لاتے ہوئے ایک نوع کے خیالات کو مسلسل دوسری نوع کے خیالات میں تبدیل کرتا رہتا ہے"۔ لاشعور کی اسی صفت کی بنا پر مجرّد خیالات اور احساسات، خواب میں مجسّم شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ خواب کی تعبیر کا علم درحقیقت انہی علامات اور تماثیل کے سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تمثیل گری کے عمل میں لاشعور کا سارا انحصار چونکہ ان خارجی اجسام پر رہتا ہے جو حسّیات کے ذریعے لاشعور کے تجربے میں آتے رہتے ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا سرمایۂ تجربات ہر دوسرے شخص سے مختلف ہوتا ہے اس لیے تعبیرِ خواب کا علم ایک انتہائی پیچیدہ علم ہے۔ اس ضمن میں خود ہمارے علماء و قدماء نے جو حیرت انگیز تحقیقی کام سرانجام دیا ہے اسے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر عبدالعزیز دبّاغ کا یہ قول جو "ابریز" سے لیا گیا ہے کس قدر علم افروز ہے۔

"خواب کی صحیح تحقیق کا مدار علمِ تعبیر کے جاننے پر ہے اور یہ محض سیکھنے اور پڑھنے سے نہیں آتا، کیونکہ اس میں خود خواب دیکھنے والے کے خارجی احوال کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے کہ آیا وہ شہری ہے یا گاؤں کا رہنے والا۔ اہلِ علم میں سے ہے یا عوام میں سے۔ نیز اس کا پیشہ کیا ہے، آیا سبزی فروش ہے یا تاجر یا کاریگر کیا وہ مالدار ہے یا تنگدست وغیرہ وغیرہ پھر اس کے باطنی خیالات کا جاننا بھی ضروری ہے کہ آیا روح نے ذات کو اپنے تمام اجزاء عطا کر دیئے ہیں یا کچھ اجزا دیئے ہیں اور کچھ نہیں دیئے۔ مزید برآں عطا کردہ اجزا کم ہیں یا زیادہ اور ذات میں سرِعقل کس طرح رکھا گیا ہے۔ خواب دیکھنے والے کے افکار و تخیلات کس امر میں ڈوبے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ علم تعبیر کے ماہر کے پاس سو آدمی بھی آئیں اور ہر ایک یہی بیان کرے کہ میں نے خواب دیکھا کہ میں شہد پی رہا ہوں تو وہ ماہر ہر ایک کو جُدا جُدا تعبیر دے گا جو ایک دوسرے سے میل نہیں کھائے گی۔ اس کا سبب یہی ہے کہ تعبیر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ظاہری اور باطنی حالات پر موقوف ہے اور ان میں کسی دو اشخاص کے بھی حالات ایک سے نہ نکلیں گے۔ تیسرے کا ذکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی کیا۔ حالات معلوم ہونے کا یہی فائدہ ہے "

غرض علم النفسیات میں ہمارے اسلاف نے جو تحقیقی کاوشیں کی ہیں وہ موجودہ دور کے ماہر نفسیات سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں بلکہ اگر قدیم علمائے اسلام کے علمی نظریات کا جدید نفسیات کے علمی نظریات سے مقابلہ کیا جائے تو بعض حیرت انگیز مماثلتیں سامنے آئیں گی۔ مثال کے طور پر نفسِ انسانی (HUMAN PSYCHE) کو امام غزالیؒ دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) نفس حیوانی یا روحِ حیوانی (۲) نفس انسانی یا روحِ انسانی بعینہٖ یہی نظریہ دورِ حاضر کے ایک بہت بڑے ماہرِ نفسیات کارل گستاو ژنگ نے نفسِ انسانی کے بارے میں قائم کیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی نفس انسانی کو PSYCHOID اور ARCHTYPE میں تقسیم کرتا ہے جن میں اوّل الذکر کو وہ نفسِ انسانی کا وہ حصہ قرار دیتا ہے جس میں حیوانی جبلّتوں کی کارفرمائی ہے لیکن مؤخر الذکر میں انسان کی وہ تمام نفسی حقیقتیں شامل ہیں جو جبلّتوں سے بلند ہو کر اسے اخلاقی اور روحانی رفعتوں کی طرف لے جاتی ہیں پھر ان نفسی حقائق میں سب سے زیادہ بنیادی اہمیت کی حقیقت کو وہ "خودی" کا نام دیتا ہے خواب کے عالم میں یہ عین ممکن ہے کہ روحِ انسانی کے امور روحِ حیوانی بلکہ جنسی تمثیلات میں ظاہر ہوں۔ امام ابن سیرینؒ نے "تعبیر الرؤیا" میں متعدد خوابوں کی تعبیر اسی انداز سے کی ہے۔ "کیمیائے سعادت" میں امام غزالیؒ نے آخرت کی معرفت کی بحث کے ضمن میں عالمِ خواب کے اِس پہلو کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"تعجب تو اس بات پر ہے کہ انسان کو خواب میں قیامت کے حالات بھی نظر آجاتے ہیں "

آخرت کی زندگی کو خواب کی تمثیل پر قیاس کیا جائے تو یہ بات بخوبی ذہن نشین ہو سکتی ہے کہ آخرت میں کس طرح غیر مجسّم اعمال اور معانی تمثیلی پیکروں (SYMBOLS) کی صورت اختیار کر سکتے ہیں بقول علامہ اقبال ؒ

موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر

رویائے برزخ کے ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رویائے صادقہ "صحیح بخاری" میں منقول ہے جس میں نمازِ صبح سے غافل رہتے ہوئے بستر سے سر نہ اٹھانے والے سر کا کچلا جانا، جھوٹے کے جبڑے اور گلپھڑے کا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کے برہنہ بدنوں کا تنور میں جلنا، خون چوسنے والے سود خور کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی خون کے دریا میں تیرنا اور غریبوں کی روزی چھین کر سرمایہ جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا ان کے دنیوی اعمال ہی کی تمثیلات عذاب ہیں ۔ اسی طرح بعض لوگوں کی زندگیوں میں حسنِ عمل اور سوءِ عمل کی برابر برابر میزان کی وجہ سے ان کے آدھے جسم کا خوبصورت اور آدھے جسم کا بدصورت ہونا بھی ان کے نامۂ اعمال کی تمثیل ہے اور صاف و شفاف نہر کی رحمتِ الٰہی سے تشبیہ بھی اسی قیاس پر ہے ۔ غرض ہر شخص اپنے عذاب کے اسباب یہاں سے مہیا کر کے آخرت میں لے جا [illegible] ہے جو دنیوی زندگی میں اس کے وجود کے اندر پوشیدہ رہتے ہیں ۔

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں   اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اسی لیے حدیث رسول ہے کہ وہاں " تمہارے ہی اعمال تمہارے سامنے لائے جائیں گے "۔ جزاء کا مفہوم بالکل یہی ہے ۔ امام غزالیؒ آیۂ شریفہ :

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝

کی تشریح میں فرماتے ہیں " اگر تم عین الیقین کے مرتبے پر پہنچ جاتے تو یہاں بھی دوزخ کو سمجھ لیتے "۔ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

يَسْتَعْجِلُوْنَ بِالْعَذَابِ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۔

(یہ عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے)

اسی طرح جنت کے بارے میں قرآن کی آیات اور احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی نیکی کے معانی کی تماثیل ہیں ۔ کسی صحابی نے عثمان بن مظعون کو خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے نہر بہ رہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر فرمائی :

ذالک عملہ (یہ ان کا عمل ہے)

حضرت جعفر طیارؓ کے دونوں بازو جنگ میں کٹ گئے ، اس پر بھی آپ گردن اور شانوں سے علم تھامے رہے ۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ عالمِ ملکوت میں اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ اُڑ رہے ہیں ۔ شہیدوں کے بارے میں فرمایا گیا وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت میں سیر کرتے ہیں ، عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن ہیں ۔ انہی حقائق کی ترجمانی علامہ اقبال " جاوید نامہ " میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"حرکت الی الفردوس" کے باب میں مولانا روم کی زبانی یُوں کرتے ہیں :

گفت رومی اے گرفتارِ قیاس | درگزر از اعتباراتِ حواس
از تجلّی ہائے کارِ خوب و زشت | می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت
اے کہ بینی قصرہائے رنگ رنگ | اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ
آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حُور | جلوۂ ایں عالمِ جذب و سُرور
زندگی اینجا ز دیدار است و بس | ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

دورِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات نے شعور اور لاشعور کی وسعتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ شعور سطحِ سمندر پر تیرنے والی جھاگ ہے تو لاشعور باقی سارا سمندر۔ آخرت کی زندگی میں جب انسان کا لاشعور بیدار ہوگا اور جب اُس عالم میں جزا و سزا کے تمثیلی پیکر اسی دنیوی زندگی کے تجربات سے تراشے جائیں گے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوزخ کے عذاب کو اس دنیا کی عقوبتوں سے اور جنت کے انعامات کو اس دنیا کی راحتوں سے کیا نسبت ہوگی ؟ یہی وجہ ہے کہ جنّت کی راحت کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آنکھ سے دیکھنا اور کان سے سننا تو کجا اُس کا خیال تک دل میں نہیں لایا جاسکتا بلکہ فرمایا :

بَلْہَ ما اطلعتم علیہ " جو تم جانتے ہو اسے چھوڑ دو۔

اور ایک دوسری روایت کے الفاظ میں :

بَلْہَ ما اطلعکم اللہ علیہ " اسے چھوڑ دو جس پر خدا نے تم کو مطلع کیا ہے۔

غرض آخرت کے حقائق لفظوں میں سمانے والے نہیں۔ قرآنِ پاک میں جنت کے بیان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ میں :

" دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں ہے "

یعنی دوسرے لفظوں میں قرآن میں ان کا جو حال بیان فرمایا ہے ان الفاظ سے بھی آگے ہمتِ تخیّل کو اور بلند کرو۔ اقبال کہتے ہیں ؎

تو زندگی ہے پائندگی ہے | باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ بس اتنی ہے کہ جنت میں انسان ہر قسم کے جبر سے آزاد ہوگا یہاں تک کہ اسے اپنی ہر خواہش، ہر آرزو، ہر تمنّا اور ہر ارادہ کو پُورا کرنے کی قدرت حاصل ہو جائیگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآنِ پاک نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کی طرف اشارات کیے ہیں:

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (وہاں وہ جو چاہیں گے، ہوگا)۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (زخرف - ۷۱)

وہاں جو جی چاہے اور آنکھوں کو اچھا لگے (موجود ہوگا)

ان اشارات سے علامہ اقبالؒ کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ جنت "خودی" کی داخلی کیفیات (STATES) ہی کا دوسرا نام ہے بالکل قرین حقیقت ہے کیونکہ ان آیات میں جنّت کو ایک موضوعی حقیقت (SUBJECTIVE REALITY) کے طور پر پیش کیا گیا ہے جنت کو اگر مقام (LOCALITY) بھی مانا جائے تو بھی قرآن پاک جنت سے بھی ایک بلند تر منزل کا ذکر کرتا ہے جسے کسی طرح بھی "مقام" (LOCALITY) قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (سورۂ توبہ)۔

(خدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بہشتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ (وہ) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت ہائے جاودانی میں نفیس مکانات کا (وعدہ کیا ہے)، اور خدا کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے، یہی بڑی کامیابی ہے)۔

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادۂ جام سے گذر

چنانچہ وہ بلند ہمت جو اس دنیا میں اپنی تمام خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر چھوڑ چکے ہوں اُن کے لیے حُور و قصُور والی جنت تو یہیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے چہ جائیکہ وہ آخرت میں اس کو لائقِ التفات سمجھیں۔

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حُوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

© rasailojaraid.com

لہ اُخروی زندگی کے مدارج کے بارے میں علما و صوفیا نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق قرآنی آیات اور احادیث کی تاویل

© rasailojaraid.com

"رضوان من اللہ" کی منزل میں ایک درجہ یہ بھی ملتا ہے۔

وَجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (سورۂ قیامہ)

(بہت سے چہرے شوق سے ہو مک رہے ہوں گے اور اپنے پروردگار کے دیدار میں محو ہوں گے)۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے — لذتِ شوق بھی ہے وعدۂ دیدار بھی ہے

تب و تابِ محبت را فنا نیست — یقین و دید را نیز انتہا نیست

قرآنِ پاک جب ان درجات کا ذکر کرتا ہے تو انتہائی رازداری کا لب و لہجہ اختیار کر کے انسانی تخیّل کو بالکل بے دست و پا کر دیتا ہے۔

لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ٥ (ق : ۳۵)

(وہ جو چاہیں گے ہوگا اور ہمارے پاس اس کے سوا بہت کچھ ہے)۔

شاید اسی "مزید" کی وضاحت میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

آخذین ما آتهم ربهم۔ ذاریات (۵۱ : ۱۶)

(جو کچھ پروردگار دیتا ہوگا وہ لے رہے ہوں گے)

غرض انسانی عقل اِن آیات کے معانی معلوم کرنے میں سراسر درماندہ و واماندہ ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں!

(باقی)

کی ہے اور ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے مثلاً سید نور الحسن شاہ صاحب نے اپنی کتاب "الانسان فی القرآن" میں مومنین کے جنت میں مختلف درجے بیان کیے ہیں۔ ان کے بقول دُنیوی زندگی میں ہر مومن کا حال مختلف ہے اور اسی کے مطابق اس کا عمل اور ہر عمل کا نتیجہ اس کی نیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ مومنین اور مجاہدین کا ہے۔ اس طبقے میں ایمان و ایقان کی دولت کے باوجود بشری خواہشات کی طرف پورا پورا میلان پایا جاتا ہے لیکن خوفِ خدا کی وجہ سے وہ ان خواہشات سے رُکے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان مومنین کے لیے قرآن حکیم نے ایک جنت کی بشارت دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ٥ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ٥ (اور جو کوئی اپنے پروردگار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کُتُب

صحیح مسلم (انگریزی ترجمہ) ترجمہ: عبدالحمید صدیقی۔ ناشر: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور۔ جلد اوّل صفحات ۳۸۲۔ سائز ۲۰×۳۰/۸۔ قیمت ۵۵ روپے۔

یہ کتاب الگ الگ پاروں کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ اب پانچوں پاروں کو کتابی شکل دے کر جلد اوّل کی صورت میں شائع کیا گیا ہے جو کتاب الایمان، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے اور اس میں کل ۱،۷۵۴ احادیث کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے معیار، احادیث کے حواشی اور دیگر خصوصیات کے متعلق تبصرہ اسی پرچہ کے ایک گذشتہ شمارے میں آچکا ہے۔ طباعت کا معیار اچھا ہے لیکن قیمت حوصلہ شکن ہے۔ کاش قیمت کم ہوتی تاکہ احادیث کا یہ قیمتی خزانہ زیادہ سے زیادہ انگریزی خواں طبقہ تک پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ قیمت زیادہ مقرر کرنے میں ناشر کی کچھ مجبوریاں ہوں لہٰذا یہ ہی غنیمت ہے کہ دینی اہمیت کی یہ بنیادی کتاب شائع تو ہوئی۔ اس زمانے میں انگریزی میں دینی کتب کو شائع کرنے کی توفیق آخر کتنے ناشرین کو ہے۔

۔۔۔ کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا پس اس کے رہنے کے لیے جنت ہے)۔

دوسرا طبقہ مشاہدین و مقربین کا ہے۔ اس طبقے کے لوگ بھی کسی قدر پہلے طبقے سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن یہ خوفِ خدا میں پہلے طبقے کے لوگوں سے آگے نکلے ہوتے ہیں۔ یہ بشری خواہشات سے رُکنے کے علاوہ ملکوتی صفات پیدا کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں اسی لیے ان کے لیے مقرّبین کا لفظ آیا ہے اور ان کو دو جنتوں کی نوید ملی ہے یعنی بشری اور ملکوتی جنتیں۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ (اور جو شخص اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اُس کے لیے دو باغ ہیں)۔

تیسرے طبقے میں ان بزرگ اور عالی ہمّت ہستیوں کا شمار ہوتا ہے جو انبیاء اور رسولوں کے شعائر کی پیروی کرتی ہیں ان کا قلب دنیوی لذتوں کی بجائے خدا کی محبت سے سرشار رہتا ہے۔ ان کے لیے ربّ العزت نے جنت الفردوس یعنی بلند ترین جنّت کا وعدہ فرمایا ہے اور انہیں وارثون کا نام دیا ہے! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔ وراثہ میں جنت الفردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے)۔

© rasailojaraid.com